پنجابی شاعری میں مظاہرِ فطرت: شعور و آگہی کا ایک بڑا حوالہ

(اشجار و نباتات کے حوالے سے)

ڈاکٹر نبیلہ رحمٰن
چیئرپرسن شعبۂ پنجابی
پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور

NATURAL PHENOMENA AND PUNJABI VERSE

Nabeela Rahman, PhD
Chairperson Department of Punjabi
University of the University, Lahore

Abstract

Natural phenomena have significant value in Punjabi poetry, both classical and modern. Trees, plants, shrubs and crops are used as references to enlighten the world; from body to soul. Trees are associated with almost every aspect of human life. This article briefly elaborates countless aspects and meanings related to the greenery of this world used in Punjabi classical folk tales and modern poetry. Local trees, crops and shrubs used as symbols by the Punjabi poets have also been discussed. The article not only focuses Punjabi literary eco-criticism but also explains the relationship of a Punjabi with nature.

Keywords:

پنجابی زبان و ادب، شاعری، مظاہرِ فطرت، اشجار، نباتات، خواجہ غلام فرید، میاں محمد بخش، امرتا پریتم، مولوی غلام رسول

یہ حقیقت ہے کہ خارجی ماحول اور فضا نہ صرف ہماری بصارت پر اثر انداز ہوتے ہیں بلکہ ان مناظر کے اثرات ہمارے ذوق کو بھی نکھارتے ہیں۔نفسیاتی طور پر ہماری فکر و بصیرت کو روشن کرتے ہیں اور شعر و سخن کی بُہت سی جہات سے بھی روشناس کراتے ہیں۔ پنجاب (پنج + آب) جو کبھی ست آب تھا، کا جغرافیائی حدود اربعہ یوں تو مختلف زمانوں میں بدلتا رہا،لیکن یہ ہمیشہ سرسبز و شاداب رہا ہے۔ظاہر ہے کہ آنکھ کا جس سے ربط ہوتا ہے، دل اُسی کے تاروں میں بندھتا ہے۔ پھر ایک وقت آتا ہے کہ اس تعلق کی تہیں مفاہیم کی سطح سے بیان و بدیع کے بحر میں اُتر جاتی ہیں اور اس کی سرسبز و شادابی،الفاظ و خیال کی تازگی اور تطہیر کا خوش کُن احساس بھی دلاتی ہیں۔ پنجابی لوک گیتوں میں باغوں، بیلوں، درختوں،جنگلوں،کھیتوں،کھلیانوں غرض پورے زرعی ماحول کا احوال تو اظہر من الشّمس ہے لیکن ادبیات عالیہ میں ان مظاہرِ فطرت کی کثیر صورتی فضا اور مزاج اپنے انداز میں کس قدر دلچسپ و دل نشیں ہے وہ یہاں مختصراً پیش خدمت ہے۔

مثال کے طور پر پنجابی کی متصوفانہ ادبی روایت کے بانی بابا فرید گنج شکر کے کلام میں جہاں سماجی وثقافتی عناصر کی فراوانی ہے وہیں جغرافیائی ماحول اور موسموں کے حوالے سے بھی اُن کی شاعری میں کئی فکری بیانیے موجود ہیں جن میں وہ اشجار و نباتات کے اذکار و امثال سے خودشناسی و خودآ گہی ایسی تعلیمات دیتے نظر آتے ہیں۔مثلاً ان کا ایک اشلوک ہے،جس میں وہ بزرگوں اور درویشوں کی صُحبت اختیار کرنے اُن کی خدمت گزاری کے ذریعے احکام الٰہیہ سے جُڑنے کی ترغیب اس طرح دیتے ہیں:

صاحب دی کر چاکری دل دی راہ بھراند
درویشاں نوں لوڑھیے رُکھاں دی جیراند(۱)

یعنی اپنے رب کی خدمت و عبادت انجام دے اور اپنے دل کا بوجھ اتار دے (اللہ تعالیٰ کے ذکر و عبادت سے اطمینان قلب کا سامان کرلے، درویشوں اور اللہ والوں کو تو درختوں کے سے حوصلے اور تحمل کی ضرورت ہوتی ہے) درخت سایہ دیتے ہیں، پھل دیتے ہیں، لوگ انھیں پتھر مارتے ہیں اور ان کی شاخیں کاٹتے ہیں مگر یہ پھر بھی کسی کو اپنے پھل اور سایہ سے محروم نہیں کرتے ،فقیر اور درویش کے لیے بھی یہی حوصلہ اور صبر و تحمل درکار ہے۔

یوں وہ بزرگ ہستیوں کے وجود کو درختوں کی صفات سے مشابہ کرتے ہیں اور ان درختوں، پودوں، جڑی بوٹیوں اور گھاس کے ذکر کے ذریعے وجودِ الٰہی سے تعلق جوڑنے کے ساتھ ساتھ خودآ گہی، صبر واستقامت، جبر کے خلاف آواز اُٹھانے کا اعتماد اور شعور بھی دیتے ہیں:

کُوک فریدا کوک جیوں راکھا جوار
جب لگ ٹانڈا نہ گرے، تب لگ کُوک پُکار(۲)

یعنی بولو! آواز بلند کرو (کُوک شور۔اونچی آواز۔ چیخ۔زور سے آواز لگانا) جیسے جوار کی فصل کی حفاظت کرنے والا آواز بلند کرتا ہے تاکہ چرند پرند اُس کی فصل خراب نہ کریں۔اسی طرح تم بھی اپنی زندگی کی حفاظت کرو، بولو،ظلم کے خلاف آواز اٹھاؤ تاکہ کوئی ظالم تمھارا حق غصب نہ کرے۔زندگی کے ختم ہونے تک اپنی آواز بلند کرتے رہو۔

کندھی اُتے رُکھڑا کچرک بنھے دھیر
کچے بھانڈے رکھیئے کچرک تائیں نیر(۳)

یعنی دریا کے کنارے پر جو چھوٹا سا درخت ہے وہ کتنی دیر تک ہمت باندھے اور پانی کا مقابلہ کرے؟ (وہ تو کٹاؤ سے جائے گا) اسی طرح مٹی کے کچے برتن پانی میں کب تک رکھ سکتے ہیں؟ (یہی حال اس دُنیا کا اور اس میں انسان کی زندگی کا ہے، مٹی کا بت، کچے دھاگے کی طرح سانسیں ہیں۔کس قدر بے ثبات اور عارضی زندگی ہے!!؟) ایک اور جگہ میں فرماتے ہیں:

تھیو پواہی دبھ ، جے سائیں لوڑیں سبھ
اک چھجے، بیا لتاڑیئے، تاں سائیں دے در واڑیئے (۴)

یعنی اگر تجھے اپنے رب تک مکمل رسائی درکار ہے تو پھر رستہ میں بچھنے والی دبھ (دوب) نامی گھاس بن جا، جو ایک تو نرم پڑتی ہے (ڈھیلی ہو کر پھیلتی ہے) دوسرے اسے پاؤں سے روندا جاتا ہے تب جا کر اللہ تعالیٰ کے آستانے یعنی مسجد میں لے جا کر بچھانے کے قابل ہوتی ہے (یہ تواضع سے نرم پڑنے اور اللہ تعالیٰ کے حضور قبولیت پانے کی مثال ہے۔

اپنے ایک مشہور شلوک میں وہ جنگل اور بیلوں میں رب کے ڈھونڈنے کی ایک مقامی روایت کا ذکر یوں کرتے ہیں:

جنگل جنگل کیا بھویں، وَن کنڈا موڑیں
وَسی رب ہیا لیئے جنگل کیا ڈھونڈیں(۵)

یعنی تو ایک جنگل سے دوسرے جنگل میں کیا گھومتا پھرتا ہے اور جنگل کے کانٹے روندتا پھرتا ہے، رب تو تیرے پاس پاس ہے۔تو اسے جنگل جنگل کیا ڈھونڈتا پھرتا ہے۔اللہ تو انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

بابا فرید کے بعد پنجاب کا وسیبی، ثقافتی وسماجی نفسیات کا منظر نامہ سب سے زیادہ گرونانک دیو کے کلام میں ملتا ہے۔

نانک گُر سنتوکھ رُکھ دھرم، پھُل پھل گیان
رس رسیا ہریا سدا پکے ، کرم دھیان
پت کے ساد کھادا لہے دانا کے سِردان

سوئنے کا برکھ پت پروالا پھُل جوے ہر لال
تت پھل رتن لگیہے مُکھ بھاکھت ہر دے ردے نہال(۶)

یعنی نانک گرو، استاد، مرشد، رہبر صبر و یقین کے مذہب کا ایسا درخت ہے، جس پر عرفان کے پھل اور پھول آتے ہیں کہ مرشد کے کرم اور دھیان سے اس کا پھل ہمیشہ رس سے بھرا رہتا ہے اور خالق کی عنایت سے اس کے پھل کا ذائقہ لذیز رہتا ہے۔ سوئنے کے درخت کے پتے مونگے سے ہرے اور پھل لعل و جواہرات جیسے ہوتے ہیں۔ پھر اُس کے منہ سے نکلا ہوا ہر کلمہ اور کلام دل و روح کو سکون، خوشی و شادمانی دیتا ہے۔

تسخیر ذات اور ذاتِ احد کی تلاش کے حوالے سے جنگل، بیلوں اور جزیروں کا تذکرہ ہمیں شاہ حسین، بُلھے شاہ، میاں محمد بخش اور دیگر صوفیا کے ہاں بھی مختلف پیرائے میں ملتا ہے۔ لیکن بحر و بر کے ان مظاہر کے مشاہدوں میں صوفیا نے کائنات کے بھید تلاش کرنے کی سعی کی، اور ان مناظرِ قدرت اور نقوش فطرت کو انسانی باطن میں معکوسِ ذاتِ احد قرار دیا ہے، انسانی وجود جس کا مظہر ہے۔ یوں صوفیا کے ہاں جنگل، بیلے اور باغات ایک طرف تفہیمِ ذات و کائنات کی کلید قرار پاتے ہیں تو دوسری طرف پودوں اور ان کے پھلوں کے حوالے سے وہ مقامی ثقافتی رنگوں کو بھی پیش کرتے ہیں۔ پیلو اور ڈیلھے (کریر کا پھل) چولستان کے خاص میوے ہیں جو موسم بہار میں آتے ہیں۔ خواجہ غلام فرید کی ایک کافی ہے:

آچُنوں رل یار

آچُنوں رَل یار پیلّوں پکیاں نی وے
کئی بگڑیاں، کئی ساویاں، پیلیاں
کئی بُھوریاں کئی پِھکڑیاں نِیلیاں
کئی اُودیاں، گُلنار
کٹوِیاں رَتیاں نی وے(۷)

بار تھئی ہے رشکِ ارم دی
سُک سڑ گئی جڑھ ڈکھ تے غم دی
ہر جا باغ بہار
ساکھاں چکھیاں نی وے
پیلو پکیاں نی وے(۸)

یعنی آؤ دوست مل کر پیلو چُنیں۔ یہ پکے ہوئے پیلو سفید، ہرے اور پیلے ہیں ان میں سے کئی بُھورے اور ہلکے نیلے ہیں کئی دُودھیا اور کئی سُرخ رنگ کے ہیں۔

یعنی صحرا رشکِ ارم بن گیا ہے۔ دُکھ درد کی جڑیں سُوکھ گئی ہیں اب ہر جگہ باغ و بہار کا منظر ہے اے دوست؟ ہم تو یہ میوہ چکھ چکے ہیں!

بہار کی وجہ سے صحرا میں جال کے ہر چھوٹے بڑے درخت پر خوشحال انسانی آبادی کے منظر کا گماں ہوتا ہے جہاں سینکڑوں لوگ خوش و خرم ہیں، پیلو کھا رہے ہیں، اور جنگل میں منگل منا رہے ہیں۔

خواجہ غلام فریدؒ کلاسیکی صوفی شاعری کا ایسا نام ہیں جنھوں نے مناظرِ فطرت کی عکس نگاری اپنی کافیوں میں ایک مصوّر کی طرح منظوم کی ہے۔ ایسا مصور جو سالکِ حق کو ان ریگستانوں، نخلستانوں اور روہی رنگ رنگیلڑی کے ذریعے منازلِ سلوک طے کرنے میں معاونت کرتا ہے بلکہ سالک کا رفیق اور رہبر معلوم ہوتا ہے۔ ایک طرف یہ منظر آنکھوں کو بھلا معلوم ہوتا ہے اور دل کی طمانیت کا باعث بنتا ہے تو دوسری طرف من میں ایک جوت بھی جگاتا ہے، جس کی روشنی سے من میں اُجالا ہوتا جاتا ہے اور یہ روشنی دائمی رہتی ہے۔ روہی کے خودرو کیکر، کریر اور شرینہہ اپنے خوشبودار پھلوں، پھولوں اور خواص کے باعث شاعر کی تسکینِ قلب کا سبب بھی ہیں اور اُس کے من کی باطنی کیفیت کے نمائندہ بھی۔

فقیر قادر بخش بیدل کافی کے چوتھے کلاسیک شاعر ہیں۔ ان کے ہاں جہاں کافی اپنی مختلف ہیئتوں مثلاً گیت، غزل، مثلث، مربع اور مخمس میں ملتی ہے، وہیں وحدت الوجودی فکر کے بیان کے لیے بیانیے کی رنگارنگی بھی بھرپور ہے۔ اُن کی کافی ہے:

باغ بہاراں من نہیں بھاوندے، باجھوں ویکھن یاراں   وفی انفسکم ہر دے اندر، خوب کھلے گلزاراں
جوئی گُل، گلزار بھی اوئی، سوئی بسنت بہاراں   ویکھ تماشا وحدت والا، مست ہوئے ہوشیاراں
جس نے بُو بہار دی پائی، بھُل گئے سبھ کاراں   ہار سنگھار عجائب کیتا، رل مل گُل رخساراں
قمری بلبل ویکھ تماشا، پل پل کرن پکاراں   بیدلؔ عشق دا لالہ وانگر، داغ ڈِتا دلداراں
کُل شیءٍ ھُو ھو اللہ، ہکو وچ ہزاراں

یعنی محبوب کی مہر بھری نظر پڑ جائے تو بہاروں اور باغوں کی رونق من کو بھاتی ہے۔ وفی انفسکم أفـلا تبصرون (سورۃ الذریت آیت 21) وہ تمہارے اندر ہے تو کیا تم اسے دیکھ نہیں پاتے۔ یعنی کائنات کے ہر نفس میں، ذات الٰہی کے حسن کی بہار کِھلی ہے، جس میں پھولوں کے رنگ و بُو کی صورت میں ایک گلزار ہے، جو دائمی ہے، ہمیشہ ہے مگر ذاتِ الٰہی کی یہ قدیم و دائم نسبت وہی دیکھ سکتا ہے جس نے اُسے پا لیا ہے اور جو اس منزل تک پہنچا وہ کیسا ہی عقل و فہم والا ہو وہ فہم کے ان دریچوں سے ہی جب ذات احد کے رنگوں کی نسبت اور شنگھار دیکھتا اور محسوس کرتا ہے تو اس کے مجال میں مست ہو جاتا ہے۔ قمریاں اور بلبل قدرت کی اس صناعی پر اش اش کرتی ہیں۔ اے بیدلؔ لالہ کے سُرخ پھول کی طرح محبوب حق کے عشق کا پھول میرے دل میں نشان بن گیا۔ ایسا نشان جس کے ذریعے میں تمام کائنات کے اجزاء میں صرف ذاتِ احد ہی کو دیکھتا ہوں۔ (۹)

شاہ حسین اور بلھے شاہ نے کپاس چُننے سے دھاگا بننے اور کاتنے تک کے عمل کو ظاہری زندگی میں صالح اعمال کرنے سے یوں جوڑا ہے کہ انسان پر زندگی میں عمل و اخلاص، محنت و محبت اور موجود و وجود کی کئی پرتیں کھُلتی ہیں۔ مثال کے طور پر بلھے شاہ کی ایک کافی ہے:

سب اکو رنگ کپاہیں دا/ چونسی، پینسی، کھدر دھوتر
ململ، خاسا، اکا سُوتر/ پُونی وچوں باہر آوے
بھگوا بھیس گُسائیں دا/ سب اکو رنگ کپاہیں دا

یعنی چونسی، چار سو تاروں والا کھدر، پینسی جس کے تانے میں پانچ سو تاریں ہوں یعنی پانچ سو تاروں والا کھدر، کم معیاری کھدر اور پتلا کپڑا، یا ململ جیسا باریک کپڑا، سب میں کپاس کا ایک ہی دھاگا استعمال ہوتا ہے اور اسی سے بھانت بھانت کے رنگوں کے کپڑے بنائے جاتے ہیں مگر ان کی اصل ایک ہے۔(۱۰)

داستانوی ادب پر نگاہ ڈالیں تو ہر داستان میں قدرت کی صناعی کی مدح سرائی کے ساتھ علاقائی وجغرافیائی معلومات اور ماحول کی منظر کشی بھی خوب نظر آتی ہے۔ مثلاً داستان ہیر جس کا بیشتر حصّہ پنجاب کے بیلوں، باروں اور اُس سے جُڑے پُر رونق ورنگین مناظر پر مشتمل ہے، بلا مبالغہ پنجاب کی دیہی زندگی کی تفسیر ہے نیز اس میں دیہاتی فطرتی ماحول کے ساتھ ساتھ باغ، بیلے اور بہار بطور فکری استعارہ بھی موجود ہیں اور قصّے کا آغاز ہی وارث شاہ نے یوں کیا ہے:

حُکم من کے سجناں پیاریاں دا قِصّہ عجب بہار دا جوڑیا اے
فقرہ جوڑ کے خوب درست کیتا، نواں پھُل گلاب دا توڑیا اے(۱۱)

جبکہ ہاشم شاہ نے داستان 'سسی پنوں' میں بالواسطہ و بلاواسطہ منظر نگاری کی ہے:

بُہت عجائب سرو کھلوتے، باغ چوفیر دیواراں — فرش زمین زمرد آہا ثابت نقش نگاراں
نہراں حوض فوارے برسن، ہر ہر چوک بہاراں — ہاشم شور جناور کردے، شور چکور ہزاراں
گھائل عشق کھڑے گُل لالہ، نال لہو مُکھ دھوتے — سیب، انار، انگور بھرے رس، چُنج نہ لاون طوطے
قمری کُوک کرے فریاداں، سرو آزاد کھلوتے — ہاشم ویکھ بہار چمن دی، رُوح رہے وچ غوطے

یعنی دیواروں کے چاروں طرف نایاب سرو ایستادہ ہیں جبکہ باغ کا فرش زمرد کی طرح سبز اور صاف نظر آتا ہے جس میں حوض، فوارے اور نہریں بہار کو ہر سُو سے حُسن آمیز کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ہزاروں مور اور چکور اپنی آوازوں سے اسے پُر رونق کر رہے ہیں۔ عشق میں گھائل خون رنگ گُل لالہ ہے اس میں انار، رس بھرے انگور ہیں۔ طوطے ان سے مطلوب ہیں قمریاں کُوک پکار کر رہی ہیں۔ ہاشم چمن کا یہ منظر دیکھ کر روح مسرور ہے۔(۱۲)

پنجابی داستانوں میں باغوں اور باغیچوں کی ایسی منظر نگاری بکثرت ملتی ہے جو اُن کرداروں کی

حرکات وسکنات، اعمال و افعال کے ساتھ ساتھ شاعر کی باطنی و داخلی کیفیات کی بھی ترجمان ہوتی ہیں مثلاً میاں محمد بخش نے داستان سیف الملوک میں تصوف کے رموز و مدارج کے ساتھ ساتھ ذاتِ احد وحق کی صفت وثنائی کے لیے گلشن و باغات کا ذکر کمال خوبی سے کر کے حمدیہ شاعری میں نیا اسلوب متعارف کرایا:

کام تمام میسر ہوندے نام اوہدا چت دھریاں
رحموں سُکے ساوے کردا قہروں ساڑے ہریاں
قدرت تھیں جس باغ بنائے جگ سنسار تمامی
رنگ برنگے بوٹے لائے کُجھ خاص کُجھ عامی
ہکناں دے پُھل میٹھے کیتے پت اوہناں دے کوڑے
ہکناں دے پُھل کاری آنون نفعے پھلاں دے تھوڑے
ایس عجائب باگے اندر آدم دا رُکھ لایا
معرفت دا میوا دے کے واہوا پھل دار بنایا
رحمت دا جد پانی لگا تاں ہویا ایہ ہریا
ہر ہر ڈالی نے پھل پایا سر دھرتی جد دھریا

یعنی تمام کام اُس ذات کو دھیان میں رکھ کر آسان ہو جاتے ہیں کیونکہ وہ اپنے رحم سے سُو کھے ہوئے ہرے کرتا ہے اور قہر سے ہروں کو جلا دیتا ہے۔ وہ جس نے اپنی قدرت کاملہ سے تمام جگ بنائے۔ اس باغ میں خاص و عام بنائے۔ ایک وہ جو جن کے پھل میٹھے، پتے کڑوے ہیں اور ایک وہ جن کے پھول کارآمد ہیں جبکہ پھلوں کے فوائد کم ہیں۔ اس عجیب باغ میں ربّ نے آدم کا درخت لگایا۔ معرفت کا پھل دے کر اسے خاص بنایا جو اُس کی رحمت کے پانی سے ہرا ہوتا ہے اور جب انسان سجدہ ریز ہوتا ہے تو اُس کی ڈالی میں پھل لگنے لگتے ہیں۔ (۱۳)

اسی طرح جب ہم مولوی غلام رسول عالمپوری کی مثنوی 'احسن القصص' کی طرف آتے ہیں تو وہاں ہمیں زلیخا کے باغات میں اُگے پھلوں، میووں اور ایسے مصالحوں کا ذکر ملتا ہے جو مرض محبت میں مبتلا مریضوں کے لیے باعثِ شفا ہیں۔ زلیخا عشقِ یوسف میں بیمار ہے تو حکما اُن کی بیماری کا علاج اُس کے باغ میں اُگے درختوں کے پھولوں اور اُن پھلوں کے مغزوں میں پوشیدہ بتاتے ہے۔ یوں تو کئی دیگر علوم بھی اِس داستان کا حِصّہ ہیں لیکن یہاں صرف علمِ شجر و نبات کی ایک مثال پیش کی جا رہی ہے جس سے مولوی صاحب اپنے علم، فضل و ہنر میں ماہرِ نباتات ہی نہیں، ماہرِ طبیب بھی معلوم ہوتے ہیں:

میوہ دار درختاں باگے خوان دھرے یغمائی
باد بہار پکھیروآں بھکھیاں ایہ خوشخبری سُنائی

نارنجوں لے رسا جوانی ٹھنڈ پوے وچ سینے
چکھ انجیر رہے وچ لب دے لذّت چار مہینے
کھاوندیاں دے جان دماں وچ ضُعف قواوَں سارے
وِرم طحال ہزال الکلیہ سینے دے دُکھ بارے
گُچھے داکھ لٹکدے اُچے جیوں کرسی پروینا‌ں
تے وچ باغ قرنفل بُوٹے لٹے ماہ جبیناں
کتے نرنج کتھائیں عنبو سرد دوائی سوکھالی
گلگل کیتے لٹکدی شاخیں پلھ گواون والی
فستق لوز دوویں وچ جوزاں کشمش پھڑے کنارے
خُشک دماغاں نوں ہر شاخوں جُھک جُھک کرن اشارے (۱۴)

پنجابی میں درختوں کے لیے رُکھ، ہرکھ، برچھ، درچھ کے الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ اُن کا اور یہاں کی متھالوجی کا بھی گہرا تعلق ہے۔ مثلاً: مرزا صاحباں کا درخت کے ساتھ موت ووصال کا تعلق رہا کہ وہی آخری آماجگاہ وہی جائے وصال بنا، نیز وہی درخت اُس کی اور مرزے کی موت اوران کے اس لمحے کا گواہ تھا۔ اسی طرح برگد، پیپل، شرینہہ، ٹاہلی، نیم، آم اور کیکر کے درختوں کا یہاں کی مقامی رہتل کا گہرا ناتا نظر آتا ہے۔

پنجابی زبان و ادب کے حوالے سے اس تعلق کو دیکھیں تو دریاؤں، کھیتوں، کھلیانوں باروں، بیلوں، جنگلوں کے جغرافیائی خدوخال اس کے لوک ادب سے لے کر ابتدائی مذہبی شاعری میں بھی بکثرت ملتے ہیں۔ لوک شاعری میں سے کچھ مثالیں:

ساڈا دیس سہاگن سارا
چپے چپے کھوہ وگدے

یعنی ہمارا پورا دیس سہاگن جیسا ہے یعنی بھرپور، زرخیز جس میں جگہ جگہ کنوئیں ہیں جو زمین سیراب کرتے ہیں۔

ٹھنڈی چھاں ہووے ایس رُکھ دی
کتھے وے ماہی میرا، میں پکھوآں توں راہ پُچھدی

یعنی اس درخت کی چھاؤں گھنی اور ٹھنڈی ہو۔ اس پر بیٹھنے والے پرندوں سے میں اپنے محبوب کا پتہ پوچھتی ہوں۔

نی لے دے مائے کالے باگاں دی مہندی
گلی گلی میں پتر چنیدی، لوکی کہندے مستانی

یعنی اے میری ماں مجھے کالے سبز باغوں سے مہندی لے کر رنگ دے۔ میں گلی گلی پتے چُنتی ہوں تو لوگ مجھے جھلی مستانی کہتے ہیں۔

پھل نیویاں رُکھاں نوں لگدے
شملے دا مان نہ کریں

یعنی پھل کم اونچے درختوں پہ لگتا ہے، اس لیے پگڑی کے اونچے شملے پر گھمنڈ نہ کرنا۔

مانواں ٹھنڈیاں چھانواں
میں سو سو رُکھ پئی لاواں

یعنی مائیں ٹھنڈی چھائیں ہوتی ہیں، میں ماتا کے سوسو درخت لگا رہی ہوں۔

یوں کلاسیکی اور لوک پنجابی ریت میں شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کے ہاں درختوں، پھولوں، بُوٹوں، کھیتوں کھلیانوں اور جڑی بوٹیوں کا ذکر کسی نہ کسی حوالے سے موجود نہ ہو۔ پھر ادب کو علوم وفنون کے ساتھ پرکھنے جانچنے کا سائنسی طریقہ اپنایا گیا اور بات ادب کے عمرانی مطالعے (Sociological Study) سے ماحولیاتی پرکھ (Eco-Criticism) تک پہنچی تو درخت ایک استعاراتی اور علامتی حیثیت اختیار کر گیا اور اِس کی یہ حیثیت نئی نہیں ہے کہ درخت کا انسان اور خالقِ کُل کے ساتھ ربط وحجاب قدیمی بھی ہے، دائمی بھی گو یہاں ایمان وعقائد کی گفتگو نہیں بلکہ صرف اشجار کی ماحول اور معاشرے میں اہمیت اور عہدِ جدید میں اس کے حوالے سے سماجی شعور وآگہی ہے کہ جہاں جہاں یہ شعور پختہ ہوتا گیا وہاں انسان درختوں سے ہم کلام ہوتے رہے اور درخت انسان کے دوست بنتے گئے۔ کلاسیکی پنجابی ادبیات میں اس کی مختصر سی تصویر کشی یا ایک جھلک کے بعد جب ہم جدید ادب پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو ماحولیاتی آگہی کے ساتھ ساتھ دوست درخت، ہمراہی درخت اور شجرِ مسیحا و پناہ گاہ جیسے تصورات کے ساتھ بھی موجود نظر آتے ہیں۔

یہاں یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ پنجاب کی قدیم تہذیب میں درختوں سے توہمات کی بے شمار کہانیاں بھی موجود ہیں۔ نیک وبدشگون بیلیں بُوٹے، درختوں کی ٹہنیوں کے ساتھ منتوں کے دھاگے اور کپڑے کی باریک کترنیں اُن کی پُورتی تک کے لیے باندھی جاتیں نیز درختوں کے ساتھ عقیدت اور تعلق کی بھی کئی مثالیں پنجابی ادبیات کا حِصّہ ہیں، مثال کے طور پر نجم حسین سید کی نظم ''گُلر'' دیکھیے جس کے بوٹے کو اُن کی ماں پُھوٹتے ہی نکلوا دیتی تھی لیکن زمین میں کئی پودوں کے تنے نہیں، جڑیں سفر کرتی ہیں پھر جہاں انھیں اُبھرنے کا موقع ملے وہیں سے آغاز کرتی ہیں یوں انھوں نے گُلر کی تمثالی کہانی کے ذریعے یہ سمجھایا کہ بُوٹے اور درخت منحوس نہیں ہوتے، اُن کا جو کام نظامِ قدرت میں متعین کردہ ہے وہ تو وہی انجام دیتے ہیں ہم ہی اپنے عقائد میں توہم کی آمیزش سے عقیدت اور خوف کو کئی اشکال دیتے ہیں اور فطرت اپنا فرض انجام دیتی رہتی ہے:

ویڑھے ساڈے وچ ہاُوٹا گُلر ے نا
ذرا جیہا سِر کڈھے اوہ تے ماؤمھاڑی کپوا چھوڑے
اکھے گُلر جتھے ہووے وِرانی کرنا/ٹُنڈ رہ جُلنا
رُت اشنی تے پُھٹ پینا/ چالیہ ورہے کیچی گُلر
ماؤ مری!
میں اُڈیکاں پُھٹے تے کپاں ماؤنی رِیتی/ رُت لنگھی اوہ پُھٹیا کوئی نہ
اسیں حیران تھئے/گل وِسری
ٹُنڈ وی سَڑ سُک مِٹی رلیا/ ہِک دن باہر لی کندھ تلے میں تکاں سڑ کے آلے پاسے
گُلر ے نے دو بُوٹے/سمجھ رلی تے ایتنی
وَرانی کرے نہ کرے/گُلر حیرانی کرنائے

یعنی ہمارے صحن میں گُلر کا ایک پودا تھا جب ذرا سی کونپلیں نکلیں تو ہماری ماں اسے ترشوا دیتیں اور کہتیں کہ گُلر کا پودا جہاں ہو، وہاں ویرانی آ جاتی ہے اور اُس کے پتے اُتروا دیتیں اور صرف اُس کا تنارہ جاتا۔ جب موسم بدلتا تو وہ پھر ہری ہونے لگتی۔ چالیس برس میں اپنی ماں کو ایسے ہی کرتا دیکھتا رہا۔ ماں کی دائمی مفارقت کے بعد میں انتظار کرنے لگا کہ گُلر پھوٹے تو میں اپنی ماں کی ریت نبھاؤں۔ لیکن موسم بدلنے پر بھی اس بار وہ پھوٹی نہیں، ہم بات بھول گئے۔ لیکن ایک دن میں بیرونی دیوار کے پاس سڑک کے اردگرد دیکھ رہا تھا تو گُلر کے دو پودے نکلے ہوئے تھے، جنھیں دیکھ کر مجھے سمجھ آئی کہ گُلرے کا پودا ویرانی کرے چاہے نہ، حیرانی ضرور کرتا ہے۔(۱۵)

اشجار و نباتات فطری ماحول کا بنیادی جُزو ہیں کہ صاف آب و ہوا اور صحت مند فضا اسی سے ممکن و مشروط ہے اور انسان، چرند پرند، حیوانات غرضیکہ ہر سانس لیتی مخلوق کے نظام تنفس و بحالی صحت کے لیے ان کا ہونا پانی اور ہوا کی طرح ہی ضروری ہے۔

امرتا پریتم اپنی ایک نظم ''ورش کُنڈ'' یعنی برسات کے پانی سے بھرا ہوا تالاب، میں درختوں کی متھاس کے ذریعے عشق کے آداب و کیفیات کو خوبصورتی سے بیان کرتی ہیں وہ وسیب کے ساتھ ماحولیاتی شعور و آگہی بیدار کرتی بھی نظر آتی ہیں۔

ورش کُنڈ: (برسات کے پانی سے بھرا ہوا تالاب)

اوہ ورش کُنڈ کتھے ہے؟ اوس واواں نوں پچھیا، تے واواں نے کہیا
ایتھے ہی کتھے ہوندا سی تھیہہ جیہا دسدا سی
کوئی جیو جنتو وی پستیاں راہواں تے نہیں آوندے تے ورہے پچھوں تھیہہ وی سنجاتے نہیں جاندے

پھیر کُجھ رُکھاں دی ہری چھاویں اوہ رتھ وچوں اُتریا
رُکھاں دے پیر چھُوہے تاں رُکھاں نے جڑھاں تیکر اک ہوکا لیا
کہن لگے آ جیویں بس تیرا مونہہ تکنا سی سو راہواں تے کھلوتے ہاں
نہیں تاں کیہہ پتہ ہوندا تے کہاڑیاں دی رُتے
ساہواں دا وساہ نہیں پیندا

یعنی وہ برسات کے پانی سے بھرا ہوا تالاب کہاں ہے؟ اس نے ہواؤں سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ یہیں کہیں ہوتا تھا نشان بتاتے ہیں۔ کوئی بھی نچلی راہوں کا مسافر نہیں ہوتا اور سال بعد جگہیں بھی پہچانی نہیں جاتیں، پھر کچھ ہرے درختوں کی چھاؤں میں (دو بیلوں والی اُس کی گاڑی) رتھ اُترا۔ درختوں کے پیر چھوئے، تو درختوں نے اپنی جڑوں تک آہ بھری اور بولے کہ بس جیسے صرف تمھاری صورت ہی تکنا تھی، سو راہوں میں کھڑے ہیں۔ نہیں تو کیا معلوم ہوتا ہے ہونے کا کیونکہ کلہاڑیوں کے موسم سانسیں بے یقین ہوتی ہیں۔(۱۶)

جدید پنجابی نظم میں 'درخت' بطور استعارہ، اشارہ، کنایہ اور علامت کے طور پر غرض کئی طرز سے استعمال کیا گیا ہے۔ سبزے اور درختوں کی کمیابی کے باعث ماحولیاتی آلودگی جسمانی صحت کے ساتھ ساتھ جہاں سماجی ماحول کو متاثر کرتی ہے وہیں یہ عصری سماجی صورتحال کی تصویر کشی بھی خوب کرتی ہے۔ صابر علی صابر اور ریاض کھوکھر کی دو نظمیں سماجی ماحولیاتی آلودگی کی طرف واضح اور مبہم اشارے بھی ہیں اور سماجی طنز بھی:

چھانگے رُکھ سی چھاں کیہ دیندے اس موسم نوں ناں کیہ دیندے
ویڑھے وچ بندوقاں ٹنگیاں پیار سُنیہے کاں کیہ دیندے

یعنی ترشے گئے درخت کیا چھاؤں دیتے، اور ان موسموں کو کیا نام دیتے، صحن میں بندوقیں لٹکی ہوں تو کوّے محبت کے پیام بر کیسے ہوں؟ (۱۷)

گولڈن جوبلی

کُجھ ایانے بوڑھ ہیٹھاں بیٹھے کرن حساب
جیہڑی پیلی وچ سن بیجے وڈیاں پھُل گلاب
پھُلاں دی تھاں اوتھے اُگے کئی کنڈیالے رُکھ
چڑیاں بھکھم بھانیاں، تے سُوراں بھر لئی کُکھ

یعنی کچھ بچے برگد کے نیچے بیٹھ کر جانچ پڑتال کر رہے تھے کہ جس کھیت میں ہمارے بزرگوں نے گلاب کے بیج بوئے تھے وہاں کانٹوں بھرے درخت کیسے اُگ آئے، جہاں چڑیاں بھوکی ہیں اور انھوں نے نوکیلے کانٹوں سے اپنی کوکھیں بھر لی ہیں۔(۱۸)

جدید پنجابی ادب میں 'درخت' کو بطور سماجی استعارہ سب سے زیادہ استعمال کیا گیا۔ پنجاب کے

سماجی جیون میں جہاں سانجھ اور جُڑت اس کے ڈھانچے کے بنیادی ستون ہیں جب کہ اس نظم میں تنہائی، اکلاپا، ہجرت، عدم توجہی کو شاعر نے ایک طرف تنہا درخت کے نوحے کی صورت میں پیش کیا ہے اور اپنے احساسِ محرومی کو زبان دی ہے اور دوسری طرف درختوں کے احساس تنہائی اور اکلاپے کو ایک طنزیہ بیانیہ سے سمجھایا کہ وہ بھی انسانوں کی طرح ہمسری و ہمسائیگی جیسی گروہی زندگی جینے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ اُن میں بھی Mutal relationship ہوتا ہے۔ نہ ہو تو وہ کیسے احساس میں مقید ہو جاتے ہیں اس نظم میں دیکھیے:

کلّے رُکھ داوَین

کدھر ٹُر گئے مالی جیہناں رَت مُڑکا اک کر کے
مینوں چھاواں نال سجایا اک سوہنا رُکھ بنایا
کال پیا تے رات ہنیری کھا گئی میری ساوے پتّر
پی گئی میرا خُون اکھاں تک تک انھیاں ہوئیاں
کدھرے نہ کوئی پنچھی دِسیا کدھرے نہ پیار دا گاون، میں اک پنجر
میرے کول لُکدی پھرے ہوا

تنہا درخت کی پُکار

وہ مالی کہاں گئے جنھوں نے مجھے خون پانی ایک کر کے، ایک درخت بنایا تھا۔ قحط پڑا تو کالی اندھیری رات میرے ہرے پتے کھا گئی اور میرا خُون پی گئی۔ آنکھیں یہ سب دیکھ کر بے نُور ہو گئیں۔ کہیں کوئی پرندہ نظر نہیں آیا کوئی گیت سُنائی نہیں دیا۔ میں ایک ڈھانچہ ہوں اور ہوا مجھ سے چھپتی پھرتی ہے۔(۱۹)

جدید پاکستانی پنجابی شاعری کے بانی شریف کنجاہی کی نظم ''ون دا بُوٹا'' اور پوٹھوہاری لہجے کے نمائندہ شاعر باقی صدیقی کی ''ہک بوٹا'' 'درخت' اور مسافر کے بیانیے میں زندگی اور انسان کی کہانی ہے۔ گویا سادہ مفہوم میں انسان کو زندگی کی ناپائیداری اور مسلسل سفر میں موقوفیت کا تصوّر سمجھایا گیا ہے۔

ہک بُوٹا

ہک بُوٹا گھل مگھلا سڑنے بلنے راہیاں کی
پتراں نی پکھّی جُھولے کتنے چیڑے، کتنے صافے
ہاڑے جیٹھے نی دُھپاں وچ دُنیا نی نظراں توں اوہلے
اس بُوٹے چھاویں بہہ کے دلاں نی بولی بولے
آن مسافر، جان مسافر ایہ پتراں نی وِتھاں وچوں
ہر راہی آں ہٹ ہٹ تکّے کوئی اس نا راز نہ سمجھے
کوئی نہ دِل پھرولے

یعنی ایک درخت جو شدید دھوپ میں آتے جاتے مسافروں کو اپنے پتوں سے ہوا دیتا ہے۔ ہاڑ،

جیٹھ کی تپتی دھوپ میں لوگوں کی نظروں سے دور لوگوں کے لیے کھڑا ہے جہاں کچھ مسافر آتے ہیں اس کی چھاؤں میں بیٹھ کر دل کی باتیں کرتے ہیں اور یہ درخت پتوں کی اوٹ سے ان مسافروں کو غور سے دیکھتا ہے۔ کوئی اس کا راز نہیں جانتا اور کوئی اس سے پوچھتا بھی نہیں۔(۲۰)

درخت کی تنہائی اور اکلاپے کے جس درد کا اظہار پنجابی نظم میں ہے، ویسا ہی احساس غزل میں بھی بھر پور ملتا ہے۔ مثلاً یونس احقر درختوں کے اکلاپے کو ہی ان کی کمیابی اور ویرانی کا یہ احساس پرندوں کی زبان میں یوں بیان کرتے ہیں:

سُکی ساوی کوئی وی ٹہنی پیر ٹکان نوں ملدی نہیں
آہلنیاں لئی چُنجاں دے وچ تیلے چائی پھرنے آں(۲۱)

یعنی ہری تو کیا اب تو سُوکھی ہوئی بھی کوئی ٹہنی نہیں ملتی جس پر ہم اپنا گھونسلا تو کیا بنانا پنجہ بھی ٹکا سکیں کہ ہم تو اپنی چونچوں میں تنکے لیے اُڑتے پھرتے ہیں۔

ایس چمن وچ رُت بہار نوں سدّن لئی
ہر کنڈے تے تتلی ٹنگنی پیندی اے(۲۲)

اس شعر میں شاعر نے بے حسی و بے کیفی کو موضوعِ سُخن کر کے قارئین میں ایک چُبھتی پھبتی بھی کسی ہے کہ باغ میں بہار کے موسم کو ملانے کے لیے ہر ایک خار پر تتلی کو خود کو قربان کرنا پڑتا ہے یوں باغ کی رونق تتلیوں کے مصلوب ہونے سے مشروط ہے۔ یعنی فطرت کی آبادکاری کے لیے رنگوں اور سانسوں کی ستیزہ کاری لازم ٹھہری ہے۔

کیہڑا پُھل کھڑان دے اپنے جتن کرے
گملے تے خشبو چھڑکا کے بہ گئے آں(۲۳)

طرہ یہ کہ ہم مصنوعیت اور عارضیت کے کُہر میں اس قدر ٹھٹھر گئے ہیں کہ قدرت کے فطری حسن وخوشبو کے احساس سے عاری ہو گئے ہیں اس مشینی دور اور ٹیکنالوجی کی یلغار یا کرامات کہیے کہ اب اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی، اب مصنوعی پھولوں پر کیمیائی مادوں سے بنی خوشبوئیں احساس لطافت کی تسکین کرنے لگی ہیں۔

یہ امر انتہائی دلچسپ بھی ہے اور حیران کُن بھی کہ دُنیا کے بیشتر ادیان و اعتقادات میں اشجارِ مقدس وممنوع کا ذکر موجود ہے جو خالقِ کائنات کے وجودِ غائبانہ اور حُکمِ یزداں سے منسوب ہے۔ قیاس کہتا ہے کہ انسان اور خُدا کے کلام کے پہلے سامع یہ اشجار ہی تھے جو اُن کے ہمراز ہوئے اور آج تک یہ اُسی عہدِ دلبری کو نبھاتے چلے آرہے ہیں۔

بس اس کرے کے باسی اِس یارِ پارینہ کی قدر کرنا بھول گئے اور کائنات کے فطری حُسن کی اولین

علامت اشجار و نباتات کے رنگ اور رابطے ابنِ آدم سے دُور ہوتے چلے جا رہے ہیں حالاں کہ ہر ذی روح کے لیے یہ ناگزیر تھے کہ جیون ربط اسی سے ماخوذ تھا۔

درختوں کے اکلاپے کی کیفیت و احساس کا ذکر تو درج بالا سطور میں آ چکا، ہمارے ہاں کچھ ایسی مثالیں بھی ہیں جن میں درخت بھی دوستوں اور ہمسایوں کی طرح اپنے داخلی احساسات و جذبات ایک دوسرے سے بانٹتے ہیں۔ سرجیت پاتر جدید پنجابی نظم کا ایک نمایاں حوالہ ہیں۔ اُن کی نظم ''دوُرکھاں دی گفتگو'' Symbiotic Relationship میں کس کس انداز میں انسانی جذبات میں ایک عجب ہلچل و ہیجان برپا کرتا ہے کیونکہ اس کا انداز کاٹ دار بھی ہے اور کانٹے دار بھی، انسانی سوچ کے مثبت و منفی دائروں میں گھومتے یہ مکالمے قاری میں مزاحمت اور آگہی جیسے رموزی تار چھیڑ جاتے ہیں۔

دوُرکھاں دی گفتگو

میری سُولی بناؤ گے کہ رُباب، جناب
کہ میں ایوں ہی کھڑوتا رہاں ساری عمر کردار ہاں پتیاں تے
موسماں دا حساب کتاب، جناب کوئی جواب؟؟!!
مینوں کیہ پتہ.......... مینوں کیہ پتہ میں تاں، آپ ہاں تیرے وانگ اِک درخت
توں ایوں کر اج دا اخبار دیکھ
اخبار وچ کُجھ نہیں جھڑے ہوئے پتے نیں
فیر کوئی کتاب دیکھ کتاب وچ بیج نیں تاں فیر سوچ
سوچ وچ ٹُک نیں دنداں دے نشان نیں
راہیاں دی پیڑ ہے جاں میریاں نہوندراں
جیہڑیاں میں بچپن لئی دھرتی دی ہِک وچ کھوبیاں سوچ..... سوچ...... ہور سوچ
سوچ وی قید ہے سوچ وچ خوف ہے
لگدا ہے دھرتی دے نال بجھا ہویا ہاں جا فیر ٹُٹ جا!
ٹُٹ کے کیہ ہوئے گا؟ رُکھ نہیں تاں راکھ سہی
راکھ نہیں تاں ریت سہی ریت نہیں تاں بھاف سہی
چنگا فیر چُپ کر میں کدوں بولداں؟
ایہ تاں میرے پتے نیں ہوا وچ ڈولدے

یعنی جناب آپ میری سُولی بنائیں گے یا رباب یا میں یونہی ساری عمر پتوں کو لیے کھڑا رہوں گا، موسموں کا حساب کتاب لیے؟ دوسرا درخت جواب میں کہتا ہے میں تجھے تیرے سوالوں کا کیا جواب دوں میں

تو خود ایک درخت ہوں تم اخبار دیکھ لو۔ وہ آگے سے کہتا ہے، اخبار میں کچھ نہیں گرے ہوئے پتے ہیں۔ تو وہ کہتا ہے پھر کوئی کتاب دیکھو۔ وہ جواباً کہتا ہے کہ کتاب میں بیج ہیں تو وہ کہتا ہے پھر سوچ دیکھو۔ وہ جواب دیتا ہے کہ سوچ میں سوراخ ہیں دانتوں کے نشان ہیں سانسوں کی باز گشت ہے یا میرے نوکیلے ناخن جو میں نے بچپن میں زمین کے سینے میں چبھوئے تھے پھر وہ کہتا ہے، سوچو، سوچو مزید سوچو۔ پھر وہ کہتا ہے سوچ بھی مقید ہے اُس میں خوف ہے، مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں زمین کے ساتھ جکڑا ہوا ہوں۔ دوسرا کہتا ہے جاؤ! پھر ٹوٹ جاؤ! ٹوٹ کر کیا ہوگا؟ پہلا پوچھتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے درخت نہ رہا تو راکھ سہی، راکھ نہیں تو ریت سہی، ریت نہیں تو بھاپ سہی۔ دوسرا کہتا ہے چلو اب چُپ کرو۔ پہلا جواب دیتا ہے میں کب بولتا ہوں یہ تو میرے پتے ہیں جو ہوا میں لہلہاتے ہیں۔ (۲۴)

اس نظم میں شاعر نے نباتات کی فطری تولید کاری (Natural Dilution Process) کے نظام کے ذریعے سے فکری شعور کی آبیاری کی ہے اور اس کے اصل اجزائے ترکیبی کو ایک تمثیل کے ذریعے بیان کرنے کی سعی کی ہے۔

بارش کے پانی یا مٹی کی نمی سے ہی اُگ آنے والی جڑی بُوٹیاں اور گھاس پُھوس اگر بے آب و گیاہ میں ہوں تو جنگل و بیلوں کا حِصّہ ہوتی ہیں جو اگر ترتیب سے اُگائی جائیں تو باغیچے کا حِصّہ ہو جاتی ہیں۔ مگر یہ خودرو نوکیلا گھاس اپنی زمین پر بم اور بارود کی کھیتیوں کے اُگنے کے خلاف ایک مزاحمتی علامتی اظہار بھی بن جایا کرتا ہے۔ پاش بیسویں صدی کا وہ شاعر ہے جو ظلم، جبر، بربریت کے خلاف سینہ سپر ہے وہ طبقاتی عدم توازن کے ساتھ ساتھ عالمی طاقتوں کے تیسری دُنیا کے انسانوں پر زمین تنگ کرنے کے حربوں اور اُنھیں مختلف دھڑوں اور حصّوں کی سیاست کا ایندھن بنانے والی سبھی باطل سوچوں سے آگہی رکھتا ہے۔ وہ بظاہر بے ضرر و بے وقعت و کم مایہ نباتات سے خود کو منسلک کرتا ہے لیکن اپنے اندازِ بے باکانہ سے یوں گویا ہوتا ہے کہ ظالم کے خلاف بلند آواز اُٹھاتا ہے اور مظلوم کا حوصلہ بنتے ہوئے ظالم کے خلاف اُٹھنے کی ترغیب دیتا ہے یوں یہ لفظی و معنوی ہر دو حوالوں سے ایک نیا اندازِ بیان ہے:

میں گھاہ ہاں گھاہ میں تُہاڈے ہر کیتے کرائے تے اُگ آواں گا
بمب سُٹ دیو بھاویں وشو وِدیالے تے
بنا دیو ہر ہاسٹل ملبے دے ڈھیر
سُہاگہ پھیر دیو بیشک ساڈیاں جُھگیاں تے مینوں کیہ کروگے؟
میں تے گھاہ ہاں، ہر چیز ڈھک لواں گا
میں گھاہ ہاں، میں اپنا کم کراں گا
میں تہاڈے ہر کیتے کرائے تے اُگ آواں گا

یعنی میں گھاس ہوں، میں تمھارے تیار کیے گئے ہر میدان میں اُگ آؤں گا۔تم چاہے تعلیمی اداروں پر بمباری کر کے ڈھیر کر دو یا ہاسٹلوں کو گرا دو، غرض کہ چاہے ہر ایک شے کا صفایا کر دو یا ہمارے خیمے برباد کرو۔ میں پھر بھی اُبھر آؤں گا کہ میں گھاس ہوں، میں اپنا کام دکھاؤں گا اور تمھارے کیے کرائے پر نمودار ہو کر دکھاؤں گا۔(۲۵)

اشجار کی انسانی رشتوں ناطوں غرضیکہ خاندانی ڈھانچے کے اٹوٹ تعلق کی جذباتی انداز میں تصویرکشی اس بات کی غماز ہے کہ درختوں کا وجود انسانوں کی نفسیاتی صحت کے لیے بے حد ضروری ہے۔

درخت، جنگ، رات اور ویران رستے کی ڈراتی فضاؤں کو پاش اور منیر نیازی نے اپنی شاعری میں خوف اور جرات کے استعاروں میں کمال ہُنر سے بیان کیا ہے یہی احساس جب مظہر ترمذی کے ہاں نرگسیت کے انداز میں اُبھرتا ہے تو پردیسی مظہر ترمذی جب اپنے وطن لوٹتا ہے تو درختوں سے یوں ہم کلام ہوتا ہے:

خُش وسدا اے مُلک بگانہ
سانوں ساڈی رُت نہ بھلی
بیلے، ساوی، گھاء تے چڑیاں
کِکراں دے پُھل ٹاہلیاں
کتھے جمے کتھے عمراں گالیاں

یعنی بیگانہ ملک شاد و آباد ہے، ہمیں ہمارے موسم نہیں بھولتے۔ بیلے، ہری گھاس اور چڑیاں، کیکر کے پھول اور شیشم۔ ہم کہاں پیدا ہوئے اور کہاں عمریں گزار دیں۔ (۲۶)

بیسویں صدی میں جدید تر لہجے کا کلاسیک شاعر شو کمار بٹالوی ہے جو تہذیب و ثقافت کا رموز داں بھی ہے اور مظاہرِ قدرت سے شناسا بھی، اور وہ بھی ایسے کہ قاری پہ اُس کا کلام سحر کرتا جاتا ہے۔ مثلاً اُس کی یہ نظم دیکھیے:

کُجھ رُکھ مینوں پُت لگدے نیں کُجھ رُکھ لگدے ماواں
کُجھ رُکھ نونہاں دھیاں لگدے کُجھ رُکھ وانگ بھراواں
کُجھ رُکھ میرے بابے واکن پَتر ٹاواں ٹاواں
کُجھ رُکھ میری دادی ورگے چُوری پاون کاواں
کُجھ رُکھ یاراں ورگے لگدے چُماں تے گل لاواں
اِک میری محبوبہ واکن مِٹھا اتے دُکھاواں
کُجھ رُکھ میرا دل کردا اے موڈھے چُک کھِڈاواں
کُجھ رُکھ میرا دل کردا اے چُماں تے مر جاواں

کُجھ رُکھ جد وی رل کے جُھومن | تیز وگن جد واہواں
ساوی بولی سبھ رُکھاں دی | دل کردا لِکھ جاواں
میرا وی ایہ دل کردا اے | رُکھ دی جُونے آواں
جے تُسیں میرا گیت ہے سُننا | میں رُکھاں وچ گاواں
رُکھ تاں میری ماں ورگے نیں | جیئون رُکھاں دیاں چھاواں

یعنی کچھ درخت مجھے بیٹے لگتے ہیں اور کچھ درخت ماؤں جیسے، کچھ بہوؤں بیٹیوں جیسے اور کچھ بھائیوں جیسے۔ کچھ رُکھ میرے بزرگوں جیسے، جن پر کوئی کوئی برگ ہے، کچھ درخت میری دادی جیسے جو کوؤں کو چوری ڈالتے ہیں۔ کچھ درخت جگری دوستوں جیسے، جنھیں چومتا اور گلے لگا تا ہوں۔ ان میں ایک میری محبوبہ کے جیسا ہے میٹھا بھی اور غم گیر بھی۔ کچھ درخت ایسے ہیں جنھیں میرا جی چاہتا ہے، کندھے لگا کر کھلاؤں اور کچھ درخت ایسے ہیں جنھیں دیکھ کر میرا جی چاہتا ہے کہ انھیں چوموں اور مر جاؤں، کچھ درخت جب مل کر جھومتے ہیں تیز ہوائیں جب چلتی ہیں تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں ان درختوں کی ہری بولی لکھ ڈالوں، میرا یہ جی چاہتا ہے کہ اب میں درخت کا جنم لوں کہ اگر تم میرا گیت سُننا چاہتے ہو تو میں درختوں میں سے سُناؤں کہ یہ درخت تو میری ماں جیسے ہیں، اللہ کرے ان کی چھاؤں سدا سلامت رہے۔(۲۷)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اشجار و نباتات کا زندگی سے منسلک شاید ہی کوئی ایسا حوالہ ہو جو پنجابی ادبیات میں نہ ملتا ہو۔ دراصل مقامی جغرافیہ، تہذیب، ثقافت، رسم و رواج اور سب سے بڑھ کر وہ مٹی، جہاں انسان آنکھ کھولتا ہے، شعور پا تا ہے، فکر کو پرواز دیتا ہے، وہ اُس کے لاشعور و تحت الشعور میں اُن خزانوں کی مانند ہوتی ہے جو انسان کو فہم و فراست اور ذہنی آسودگی مہیا کرتی ہے جس سے وہ سماج میں ایک نیا شعور، نئی آگہی دینے میں مدد لیتا ہے کہ نت نئے علوم کا شاخسانہ خیال سے پھوٹتا ہے۔ زمین اور صاف ماحول اس کی پاکیزگی اور پرواز کے لیے سازگار ہونے چاہئیں، ایجاد، اختراع اور فکری آسودگی اسی سے منسلک ہے۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) ظہوراحمد اظہر، ڈاکٹر۔ معارف فریدیہ؛ تعارف و ترجمہ دیوان بابا فرید الدین مسعود گنج شکر (لاہور: مرکز معارف اولیاء دربار حضرت داتا گنج بخش، محکمہ مذہبی امور و اوقاف، حکومت پنجاب ۲۰۰۵ء) ص ۱۴۳

(۲) آصف خاں، محمد۔ آکھیا بابا فرید نے (لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۸۹ء) ص ۳۱۴

(۳) آصف خاں، محمد۔ آکھیا بابا فرید نے (لاہور: پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، ۱۹۸۹ء)، ص ۱۸۰۔۱۸۱

(۴) ایضاً، ص ۹۴ (۵) ایضاً، ص ۹۷

(۶) کلام نانک۔جیت سنگھ سیتل(امریکہ:اپنا سپرنگ فیلڈ VA22153،۲۰۰۱ء)ص۲۲۱
(۷) حمیداللہ ہاشمی۔میںڈا عشق وی توں شرح کلام خواجہ غلام فرید(لاہور مکتبہ دانیال،۲۰۰۱)ص۳۵۴
(۸) نوراحمد خاں،ڈاکٹر۔دیوانِ فرید (جلد دوم)(ملتان:قصرالادب)ص۲۳۷۔
(۹) نبیلہ رحمٰن،ڈاکٹر۔فقیر قادر بخش بیدل: رمز وجود ونجاون دی (لاہور:پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگوئج آرٹ اینڈ کلچر،۲۰۱۰ء)ص۶۷
(۱۰) نذیر احمد،سید۔کلام بلھے شاہ(اسلام آباد:اکادمی ادبیات پاکستان،۲۰۰۸ء)ص۴۰
(۱۱) شیخ عبدالعزیز بارایٹ لاء۔ہیر سید وارث شاہ (لاہور:الفیصل ناشران وتاجران کتب اردو بازار،۲۰۰۱ء)ص۱۰۲
(۱۲) حمیداللہ ہاشمی۔سسی ھاشم شاہ(لاہور۔مکتبہ دانیال)،ص۱۳۵۔
(۱۳) ایضاً،ص۳
(۱۴) مولوی غلام رسول عالپوری۔احسن القصص (لاہور:پنجابی ادبی اکادمی،سن ن)ص۱۸۵۔۱۸۶۔
(۱۵) نجم حسین سیّد۔اِکناں ناہیں لون(لاہور؛رُت لیکھا۔۲۰۰۵ء)،ص۱۰۔۱۱
(۱۶) امرتا پریتم۔کاغذ تے کینوس(لاہور:سانجھ پبلشرز،۲۰۰۶ء)، ص۵۲۳
(۱۷) صابر علی صابر۔الف دا پاندھی(لاہور:سانجھ پبلشرز،۲۰۱۲ء)،ص۳۳
(۱۸) ریاض کھوکھر۔پکھّو (لاہور:ایس اینڈ کے کمیونیکیشن ،۲۰۰۸ء)،ص۱۲۰
(۱۹) ایزدعزیز۔کلّے دُکھ دا وِین(ساہیوال:پنجاب لوک لہر،۲۰۰۹ء)،ص۱۶
(۲۰) باقی صدیقی۔کچے گھڑے (لاہور:پاکستان پنجابی ادبی بورڈ،۱۹۹۴ء)،ص۱۷۔۱۸
(۲۱) یونس احقر،ڈاکٹر۔دُکھ اُڈاری لگے (لاہور:پنجابی فاؤنڈیشن،۲۰۰۹ء)،ص۶۲
(۲۲) ایضاً،ص۴۶
(۲۳) زاہد نواز۔پارے گھنے مٹی (لاہور:مسعود کھدر پوش ٹرسٹ،۲۰۰۶ء)،ص۱۴۰
(۲۴) سُرجیت پاتر۔دُھکھدا جنگل (نارتھ امریکہ:اکیڈمی آف پنجاب،۱۹۸۸ء)،ص۶۷۔۶۸
(۲۵) پاش۔ساری شاعری (لاہور:سُچیت کتاب گھر،۲۰۰۵ء)،ص۲۷۸
(۲۶) کایا کاگد۔مظہر ترمذی (لاہور:اُدم پبلشرز۔۱۹۹۸ء)،ص۸۹
(۲۷) شِوکمار:سیپورن کا وسنگریہ (لدھیانہ:لاہور بک شاپ 2۔لاجپت رائے مارکیٹ،۲۰۱۲ء)،ص۲۹۱